تصنیفاتِ

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

حکمتِ رومی

جلال الدین رومی کے افکار و نظریات کی حکیمانہ تشریح جو ماہیت نفس انسانی، عشق و عقل، وحی و الہام، وحدتِ وجود احترامِ آدم، صورت و معنی، عالم اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

فکرِ اقبال

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گرانقدر اضافہ ہے جس میں حضرت علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی بڑے دلنشیں انداز میں تشریح کی گئی ہے قیمت دس روپے

افکارِ غالب

مرزا غالب کے بلند پایہ فلسفیانہ کلام کی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

قیمت آٹھ روپے آٹھ آنے

اسلامک آئیڈیالوجی

اسلام کے مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کا دوسرے نظریات سے اور اسلامی نظریہ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کر کے ایک طرف تو مغربی دنیا کو دعوتِ فکر و نظر دی گئی ہے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو جمود و بے حسی اور تقلید پرستی کے طلسم توڑ کر حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ قیمت بارہ روپے

اسلام کا نظریہ حیات

خلیفہ صاحب کی انگریزی تصنیف "اسلامک آئیڈیالوجی" کا ترجمہ ہے۔ کتاب عثمانیہ ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت آٹھ روپے

اسلام اینڈ کمیونزم

یہ اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ ہے جس میں اسلامی تصورات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔

قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیمؒ

فنونِ لطیفہ

زاہدانِ خشک اور فقہائے بے ذوق نے اسلام کے عقائد کو اس انداز سے پیش کیا کہ معترضین کے لیے اس اعتراض کی گنجائش پیدا ہوگئی کہ اسلام میں قریباً تمام فنون لطیفہ حرام ہیں۔ اچھی شاعری کے متعلق تو ان کی زبان بند تھی کیونکہ رسول کریم صلعم خود اچھے اشعار کی داد دیتے تھے اور اچھے اشعار کہنے پر شاعروں کی انعام و اکرام سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ لیکن باقی فنونِ لطیفہ زہد خشک کی زد میں آگئے۔ موسیقی جیسی روح پرور چیز یا مطلقاً حرام ہوگئی یا مکروہ، جس سے اجتناب تقویٰ کا تقاضا بن گیا۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے صاحب کمال موسیقار گزرے ہیں۔ لیکن یہ شغل ان کا فطری اور ذوقی تھا۔ راسخ الاعتقاد مذہبی طبقہ زیادہ تر اس سے گریز ہی کرتا رہا۔ روحانی طبقے میں بعض صوفیا کی بدولت سماع حلال ہوگیا۔ لیکن اس کے حلال و حرام ہونے کے متعلق اب تک بحث جاری ہے۔ ہم نے بعض محفلوں میں دیکھا ہے کہ جہاں موسیقی شروع ہوئی وہاں سے کوئی خشک ملا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ موسیقی سے گریز کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک رفیع الشان عمارت میں چھت سے جھاڑ آویزاں تھے جن سے لٹکتے ہوئے بلور کے ٹکڑے جنبش ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر دل آویز آواز پیدا کرتے تھے۔ ایک ملا وہاں موجود تھے، وہ لپک کر اس نغمہ زا جھاڑ کی طرف گئے اور اسے دونوں ہاتھوں سے ساکن کرنے کی کوشش کی تاکہ اس نغمہ سے ان کی سمع خراشی اور دل خراشی نہ ہو۔ ایک اسی قسم کی محفلِ عروسی میں موسیقی شروع ہوتے ہی ایک شیخ الشیوخ جو ایک بڑی یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر تھے بیزار ہو کر فرار ہو گئے۔ اس یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ایک اور پروفیسر جو جید عالم ہونے کے باوجود ذوقِ جمال سے معرّا نہ تھے وہ وہیں بیٹھے رہے۔ میں نے دریافت کیا کہ مفتی صاحب! کیا آپ کو موسیقی سے گریز نہیں۔ اس کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ ان کا نام بھی عبداللطیف تھا اور انہوں نے جواب بھی نہایت لطیف دیا۔ کہ بھائی موسیقی اگر سریلی ہو تو حلال ہے اور اگر بے سری ہو تو حرام ہے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے علماء ظاہر میں فنونِ لطیفہ سے یہ بے تعلقی کیوں پیدا ہوئی اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ جواب کا پہلا حصہ یہ ہے کہ موسیقی ایک قسم کی نہیں ہوتی اور اس کا ذوق رکھنے والے

انسان بھی ایک قسم کے نہیں ہیں۔ موسیقی جذبات انگیز چیز ہے۔ ہر قسم کے جذبات موسیقی کے ذریعے سے ابھارے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں اکثر عشرت پسندوں نے اس کو ادنیٰ جذبات کی انگیخت کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔ ایک چیز جس کا نہایت عمدہ استعمال بھی ممکن تھا زیادہ تر شہوانی جذبات کا آلہ بن گئی۔ ادنیٰ انسانوں کی صحبت نے موسیقی کو غذائے روح بنانے کی بجائے غذائے شہوات بنا دیا۔ پرہیزگاروں کا ایسی صحبتوں سے اجتناب لازمی ہو گیا۔ مگر صوفیا نے جب اس کو روحانیت میں استعمال کیا تو نوائے نے روح کی دمساز بن گئی۔ اخوان الشیاطین کے سازوں میں شیطان مضراب زن تھا۔ مگر خلاصت انسانوں کو چنگ و رباب میں سے آوازِ دوست سنائی دینے لگی۔ مولانا روم کا رباب کے متعلق مشہور شعر ہے:

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست از کجا می آید این آوازِ دوست

کسی اور کا صوفیانہ شعر ہے:

کسانیکہ یزداں پرستی کنند بر آوازِ دولاب مستی کنند

اقبال کہتے ہیں:

مجبورِ یہ جہاں حوریے نالد بہ رباب اندر

اکثر علمائے اسلام کی فنونِ لطیفہ سے گریز کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر طلوعِ اسلام کے دور پر تھی۔ اس دور تک عربوں کا یہ حال تھا کہ فنونِ لطیفہ میں سے ان کے ہاں نہ مصوری تھی اور نہ حسین جمیل صنم تراشی تھی۔ لات و عزیٰ اور ہبل اور دیگر دیوتاؤں کے بت یونانیوں کے بتوں کی طرح جمیل نہ تھے۔ نہایت بھدے قسم کی سنگ تراشی تھی۔ اور یہ تمام فن جو ابھی لطیف ہونے کی بجائے زیادہ تر کثیف ہی تھا۔ ان کے مشرکانہ عقائد کا مظہر تھا۔ وہاں مصوری یا صنم تراشی نے مشرکانہ مذہب سے الگ ہو کر کوئی مستقل حیثیت اختیار نہ کی تھی۔ مصوری اور بت تراشی کا مشرکانہ مذہب سے ایسا گہرا رابطہ تھا کہ ان دونوں کا الگ کرنا محال تھا۔ اسی وجہ سے توحید کی تلقین کرنے والے انبیائے بنی اسرائیل نے جانداروں کی صورتیں بنانا حرام کر دیا تھا۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے گرد و اگرد بڑے زور کی صنم پرستی اور دیوتا پرستی تھی۔ اس کا قلع قمع اسی طرح ہو سکتا تھا کہ صورت گری کو قطعاً حرام کر دیا جائے۔ حضرت سلیمان کو شاید اپنے زمانے میں یہ خطرہ اس شدت کے ساتھ محسوس نہ ہوا اس لیے انہوں نے تماثیل بنوانے سے پرہیز نہ کیا۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ فنونِ لطیفہ بہت حد تک مشرکانہ عقائد سے آزاد ہو گئے ہیں اور انسانی فطرت اور اس کی آرزوؤں کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق مہذب قوموں کا

زاویۂ نگاہ بدل گیا ہے۔ لیکن آرٹ کے اندر غیر معمولی قوت اظہار کے ساتھ ساتھ ایک یہ آفت لگی رہتی ہے کہ ایک خطرے سے اس کو نجات ہوتی ہے تو کوئی دوسری قسم کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کیفیت مذہب کی بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً انبیاء اور صلحاء و مجددین اس کو آلائشوں سے پاک کر کے خالص بناتے ہیں۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پاتا کہ مذہب کے اندر مخرب حیات عناصر دین کا روپ دھار کر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح ادیان کی اس مسلسل تخریب سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان مذہب کو یکسر ترک کر دے۔ کیونکہ حقیقی زندگی کے تمام سرچشمے بھی صحیح دینی عقائد ہی کے اندر ہیں۔ اسی طرح فنون لطیفہ سے بھی انسانیت قطع تعلق نہیں کر سکتی۔ کیونکہ فنون لطیفہ حسن و عشق کے بہترین مظاہر اور اخلاق عالیہ کے موثر عوامل بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہر زمانے کا مصلح اعظم خواہ وہ سقراط و افلاطون کی طرح حکیم ہو یا انبیاء کی طرح گہرے روحانی وجدان سے بہرہ اندوز، اپنے زمانے کے فنون لطیفہ پر نظر ڈال کر دیکھتا ہے کہ آیا فن جذبات لطیف کی پرورش کر رہا ہے یا قلب و نظر کے لیے سامان موت ہے۔ یونانی علوم عقلیہ کے علاوہ فنون لطیفہ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ لیکن سقراط کے زمانے میں ان کے فنون لطیفہ میں بھی ایسی باتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ سقراط و افلاطون نے "جمہوریہ" میں جو ایک نصب العینی مملکت اور معاشرت کا خاکہ تجویز کیا اس میں سے شعراء کو خارج کر دینے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک شعراء کی شاعری حکمت کش ہو گئی تھی۔ ہومر کی شاعری یونانیوں کے ہاں فن لطیف کا ایک شاہکار تھی۔ لیکن اس کے اندر بھی صنمیات سموئی ہوئی تھی۔ اس میں جن دیوتاؤں کا ذکر تھا اور ان میں سے بعض معمولی انسانی شریفانہ اخلاق سے بھی عاری تھے۔ بعض دیوتا چور اور رہزن تھے اور بعض بے پناہ قسم کے زانی۔ لیکن ہومر کے ہاں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں، اس لیے سقراط نے یہ تجویز کیا کہ ہومر کے فقط منتخب حصے بچوں کو پڑھائے جائیں اور بداخلاق دیوتاؤں سے ان کو آشنا نہ کیا جائے۔ حالی کے زمانہ تک مسلمانوں کی شاعری کا جو حال تھا اس کے متعلق مسدس میں ان کے اشعار سقراط و افلاطون سے بھی زیادہ غصہ سے لبریز ہیں:

یہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بڑھ کر

عبث جھوٹ بکنا اگر روا ہے — تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
گنہگار واں جھوٹ جائینگے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

دیکھئے حالی خود شاعر ہے اور شعر ہی میں شاعروں کی مذمت کر رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

وہ شعر کی اصلاح چاہتا ہے۔ اسے مطلقاً حرام کرنا نہیں چاہتا۔ اسی غرض سے اس نے شعر و شاعری پر ایک بلیغ اور محققانہ مقالہ لکھا اور خود سید احمد خاں علیہ الرحمۃ کے زیر اثر اپنی شاعری کا رُخ بدل دیا۔ اچھی شاعری دین و اخلاق کی بھی ایسی خدمت گزار ہو سکتی ہے کہ سید صاحب نے مسدس حالی کی نسبت فرمایا کہ یہ میری تحریک سے لکھی گئی اور یہ نادر کارنامہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے روز قیامت میں اگر مجھ سے پوچھا کہ دنیا سے تو عمل صالح کا کیا تحفہ لایا تو یہ عرض کروں گا کہ میرا سب سے بڑھ کر قابل انعام و اجر عمل یہ ہے کہ میں نے حالی سے مسدس لکھوایا۔

حالی حیات افروز شاعری میں اقبال کا پیش رو ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اگر حالی نے شاعری کا رُخ نہ بدل دیا ہوتا تو شاید اقبال کا بھی ظہور نہ ہوتا۔ اقبال میں حالی کا درد ملت موجود ہے مگر اس کی حکیمانہ نظر حالی سے بہت زیادہ وسیع اور گہری ہے۔ غالب کی حکمت پسندی اور پرواز تخیل بھی اقبال کے اندر ترقی یافتہ صورت میں موجود ہے۔ غالب نے فیضانِ الٰہی کا اپنے کلام میں ہر جگہ استعمال نہیں کیا۔ وہ بہت کچھ قدیم انحطاطی روایات کا شکار رہا۔ لیکن اقبال کے ہاں تفکر و تاثر غلط روایات کے خس و خاشاک سے پاک ہو گئے۔

اقبال بھی ایک مصلح و مبلغ شاعر ہے اور چونکہ فن لطیف کی ماہیت۔ اس کے حسن و قبح اس کے صحیح اور غلط استعمال سے خوب واقف ہے اس لیے فنونِ لطیفہ پر اس کی تنقید بھی حکمت آموز اور اصلاح کوش ہے۔ اقبال کا زاویۂ نگاہ دین ہے اس لیے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ دین اور فنونِ لطیفہ کے باہمی ربط کو واضح کرے۔ "ضربِ کلیم" میں چار اشعار کی ایک نظم کا عنوان "دین و ہنر" ہے:

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اقبال کے پاس زندگی کے ہر شعبے اور ہر شغل کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے۔ اس کے پاس نفسِ انسانی کی ماہیت اور اس کے ممکنات کا ایک تصور ہے۔ جس کی وضاحت کے لیے اس نے کم و بیش ہزار شعر کہے ہیں۔ انسان کی خودی ایک لطیفۂ ازلی ہے۔ وہ صفاتِ الٰہیہ سے بہرہ اندوز ہو سکتی ہے۔ "تخلقوا باخلاق اللہ" کی تعلیم اسی خودی کی بیداری اور استواری کی تلقین ہے۔ انسان کی خودی میں تسخیر انفس و آفاق کی لامتناہی قوتیں مضمر ہیں۔ اور مقصودِ حیات ان مضمرات کو معرضِ وجود میں لانا ہے

اس کے ارتقا کی کوئی انتہا نہیں۔ یہی مقصود حیات خیر و شر کا بھی پیمانہ ہے۔ انسان نے اپنے ارتقا میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کا اصلی مقصد خودی کی ترقی ہی تھی۔ ادیان کا ظہور بھی اسی سے ہوا۔ تمام علوم و فنون اسی سے پیدا ہوئے۔ سیاست اور معاشرت کے تمام ادارے اسی سے ظہور میں آئے۔ انسان کبھی بھٹکا بھی تو اسی کوشش میں غلط روی سے بھٹکا۔ لیکن ہمیشہ گر گر کر سنبھلتا رہا۔ کبھی کبھی خودی کی غلط روی اس کو خودکشی کی طرف بھی لے آتی ہے اگرچہ وہ اس خودکشی کو بھی اپنی ہی خودی کا مظہر سمجھ لیتا ہے۔ انسان کے تمام مشاغل، تمام تصورات اور تمام ارادوں کی تہہ میں خودی کا لعل بے بہا پوشیدہ ہے۔ اس گوہر کے متعلق اقبال کا ایک شعر ہے:

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے ‌ ‌ ‌ بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے

مندرجہ صدر چار اشعار میں اقبال نے فنونِ لطیفہ کے ساتھ انسان کے دیگر مشاغل کو بھی شامل کر کے سب کے متعلق ایک ہی فتویٰ دیا ہے کہ اگر ان سے انسان کے نفس کی تمام قوتوں میں اضافہ ہو تو یہ سب عین حیات ہیں۔ اور ادب دین و سیاست اگر انسان کو تخریب اور پستی کی طرف لائیں تو سب ڈھکوسلا رہ جاتے ہیں۔ اور امتیں اس سے ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں اسی نظم کے ساتھ ایک دوسری نظم "تخلیق" پر ہے جس کا موضوع بھی یہی ہے کہ افکارِ تازہ نئے جہان تو پیدا ہوتا ہے اور جب فن و ادب میں تازہ آفرینی نہ رہے اور لوگ اگلے ہوئے نوالوں کو ہی بار بار نگلنا اور چبانا شروع کریں تو سمجھ لیجئے کہ خودی پر موت وارد ہو گئی ہے۔ مشرق کے دین اور فن دونوں میں اقبال کو زندگی کے آثار نظر نہیں آتے:

خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں ‌ ‌ ‌ ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

اقبال کی متعدد نظموں میں بہت سے اشارات اس موضوع پر موجود ہیں۔ کہ فن برائے فن ایک بے ہودہ نظریہ ہے۔ علامہ نہ علم برائے علم کے قائل تھے اور نہ فن برائے فن کے۔ کوئی مسجد بھی اگر نفاق کی خاطر بنائی جاتے تو وہ بتقلیدِ اسوۂ رسول صلعم قابلِ انہدام ہے۔ فرانسیسیوں نے پیرس میں ایک مسجد بنائی جس کے لیے کچھ رقم شمالی افریقہ کی مسلمان رعایا سے حاصل کی گئی تھی۔ اور کچھ رقم کا اضافہ حکومت نے کیا ہوگا۔ راقم الحروف کو اس مسجد کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ فرانسیسیوں کا جو سلوک مسلمانوں سے ہے وہ دنیا کو معلوم ہے۔ یہ آزادی و برادری و برابری کے علم بردار مسلمانوں کو مغلوب و مفتوح بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ریاکاری سے اپنی ملوکیت کی استواری کے لیے انہوں نے یہ مسجد بنائی تاکہ مسلمان انہیں اپنا ہمدرد سمجھیں۔ اس مسجد کی بنا نفاق و ریا تھی۔ اس لیے اس کی صناعی کے باوجود اس کا منظر حساس مسلمان کو روح فرسا محسوس ہوتا ہے۔

خاکسار کی طبیعت پر بھی یہی اثر ہوا۔ اقبال کی روح کو بھی اس سے ٹھیس لگی۔ اس اثر کو بیان کرتے ہوئے وہ ہنر کے متعلق ایک بصیرت افروز بات بھی کہہ گئے ہیں کہ محض کمال ہنر کوئی چیز نہیں جب تک کہ وہ خلوص کی پیداوار نہ ہو:

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے — کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے — تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ
یہ بتکدہ انہیں غارتگروں کی ہے تعمیر — دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

اس کے مقابلے میں مسجد "قوت الاسلام" پر "ضربِ کلیم" میں چند اشعار اور "مسجد قرطبہ" پر اقبال کی وہ لاجواب تاثر خیز اور حیرت انگیز نظم پڑھیے جس کے متعلق ایک صاحب نے جو فنونِ لطیفہ کی تنقید میں کچھ درک رکھتے ہیں لیکن خدائے مسجود و سجود کے متعلق مائل بہ الحاد ہیں، ایک روز مجھ سے کہا کہ مسجدِ قرطبہ پر اقبال کی نظم فنِ شعر کا ایک شاہکار ہے۔ یہ صاحب فن کی بحیثیت فن داد دے رہے تھے۔

اقبال مسجد قوت الاسلام کو یا مسجد قرطبہ کو محض فن کی نظر سے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ یہ تحریریں قوت حیات کے مظاہر ہیں۔ اور اصلی فن وہی ہے جو زندگی کا مظہر ہو۔ زندگی کے انفعالی اور یاس آفرین پہلوؤں کا نہیں بلکہ اس کی فعال قوتوں کا جو ارتقائی اور انقلابی ہیں۔ مسجد قرطبہ نے اقبال کے دل میں جو تاثرات اور افکار پیدا کیے ان کے اظہار کے لیے لازم تھا کہ اقبال اپنا نظریۂ فن بھی اس ضمن میں بیان کر دیں کیونکہ مسجد قرطبہ فنِ تعمیر کا ایک عظیم الشان نمونہ ہے۔ فنِ لطیف کے متعلق حکماء کے جو بلند پایہ نظریات ہیں ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ فنِ لطیف فانی کو جاودانی بنا دیتا ہے اور دریچۂ زمان سے جھانک کر انسان لازمانی حقائق سے روشناس ہوتا ہے۔ ایک اچھے شعر میں بھی یہ بات ہوتی ہے:

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

یہ چیزے دگر انہیں حقائق کا ادراک ہے جو سرمدی ہیں۔ زمانی و مکانی نہیں بلکہ الوہیت مطلقہ کا پرتو ہیں۔ اہل دل کے لیے روحانی موسیقی میں بھی یہی صلاحیت ہوتی ہے کہ نفس کو ہستی کے باطن میں غوطہ دے کر اس حقیقت مطلقہ سے براہِ راست ہم آغوش کرتی ہے۔ جس کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو بعض کوتاہ بیں گمراہ ہو جائیں۔ اور عالم کے تمام لوگوں کا زاویۂ نگاہ الٹ پلٹ ہو جائے:

سرِ پنہاں است اندر زیر و بم — فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

بعض تصویروں میں بھی یہی اثر ہوتا ہے کہ ان کو دیکھ کر صورت پرستی کی بجائے انسان کسی اور عالم میں گم ہو جاتا ہے۔

اور تصویر حقیقت مطلقہ کی طرف محض ایک اشارے کا کام دیتی ہے۔ عالم سنگ و بو اور جہانِ آب و گل میں تصویر مصور اور معمار سے زیادہ پائدار ہوتی ہے۔ لیکن کمال پائداری کے باوجود آخر کار زمانہ اس کو فنا کر دیتا ہے۔ فنِ لطیف کی جاودانی اس کے مظاہر میں نہیں بلکہ اس کی تاثیر میں ہے جو انسان کو زمان و مکان اور حوادث کے عالم سے ماورئی لے جاتا ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

انسانی تاریخ میں بڑے بڑے عظیم الشان معجزہ ہائے ہنر مرورِ ایام سے ناپید ہو گئے۔ کہیں کھنڈر باقی ہیں اور کہیں نشان بھی نہیں ملتا۔ لیکن فلاسفۂ فنِ لطیف نے فن کی خوبی اور کمال کو جانچنے کے لیئے ایک یہ معیار بھی قائم کیا ہے کہ فن جس قدر حقیقی مظہرِ حیات ہوتا ہے اسی قدر اس کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزارہا تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیدا کیئے۔ اب ان میں سے خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن سارا جہان تاج محل کو دیکھنے آتا ہے اور اسے معجزۂ فن سمجھتا ہے۔ مادی اور زمانی حیثیت سے لازوال وہ بھی نہیں۔ لیکن مقابلتاً اس میں ثبات زیادہ ہے۔ دنیا میں ہزارہا شعراء پیدا ہوئے جن کا اب نہ کوئی نام جانتا ہے اور نہ ان کے کلام کا نمونہ ملتا ہے لیکن ہومر، حافظ، سعدی، شیکسپیئر، گوئٹے پر زمانے کی دستبرد کا کوئی اثر نہیں۔ اس ثبات میں مطلقیت اور ابدیت کا پرتو ہے۔ اقبال کے نزدیک اعجازِ فن کے یہ نمونے ان مردانِ خدا کی خلاقی کا نتیجہ ہیں جن کے باطن میں زندگی کا وہ سرچشمہ تھا جسے اقبال عشق کہتا ہے۔ عشق کو موت نہیں اس لیے وہ اپنے زمانی و مکانی مظاہر کو بھی ثبات بخشنے کی کوشش کرتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام　　جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عشق کی بدولت جو اعجازِ حسن پیدا ہوتا ہے اس کے بقا میں فطرت کس قدر کوشاں ہے، اس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ پھول جو پروردگارِ حسن و عشق کے رسول ہیں چند روز اپنی بہار دکھا کر مرجھا کر خاک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے مصادرِ حیات تخم فنا نہیں ہوتے۔ "روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد" کا تسکین بخش جواب فطرت کے پاس یہ ہے کہ اگلی بہار میں ایک مرجھائے ہوئے پھول کے بیج اپنی قسم کے سو پھول پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرت بھی اپنے فنِ لطیف کے مظاہر کو ثبات بخشتی ہے لیکن یہ اندازِ ثبات ایک خاص نوعیت کا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ معجزۂ فن کی نمود زندگی کی باطنی بے تابیوں کا اظہار ہے۔ خونِ جگر سے نمود کے یہی معنی ہیں۔ مرزا غالب کا بھی یہی نظریہ تھا کہ اچھا شعر محض صناعی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ قلب و جگر

کے سوز و گداز کا نتیجہ ہوتا ہے

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دود ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

غالب ایک ولولہ انگیز اور بصیرت افروز غزل کے مقطع میں آفرینشِ شعر کی نفسیات کو بیان کرتا ہے:

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل — غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بضمیر من بری

اگر ایسے اشعار کہتے ہوئے میرے باطن پر نگاہ ڈال سکو تو تمہیں نظر آئے گا کہ گدازِ دل سے آتشیں سیال جگر کی طرف بہہ رہی ہے۔ عرفی نے بھی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے:

بحفظِ گریۂ شغولیم اگر بینی درونم را — زدل تا پردۂ چشم دو شاخِ ارغوال بینی

اقبال نے کمالِ فن سے تمام فنونِ لطیفہ کی حقیقت کو دو شعروں میں سمیٹ لیا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

مصوری، سنگ تراشی، تماثیل سازی، موسیقی، شاعری سب کو یہاں کس حسنِ اختصار سے جمع کیا ہے:

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل

ایسا بلیغ مصرعہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ فطرتِ خارجی ہو یا فنِ لطیف اس میں یا جلال پایا جاتا ہے یا جمال۔ بے پایاں سمندر اور فلک بوس سلسلۂ کوہسار میں جلال طبیعت کو متاثر کرتا ہے اور ایک نازک پھول جلال کا نہیں بلکہ جمال کا مظہر ہوتا ہے۔ بعض تعمیریں ایسی ہیں جن میں جلال کو جمال سے ہم آغوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاج محل کی تعمیر میں بڑی وسعت اور رفعت ہے۔ لیکن فن کار کا کمال یہ تھا کہ اس نے جلال کو جمال میں چھپا دیا ہے۔ اور پوری تعمیر ایک خوش نما، لطیف اور ہلکی پھلکی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ایک فرنگی صاحبِ ذوق نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کو شیشے کے ایک فانوس کے اندر ہونا چاہیئے۔ صفاتِ الٰہیہ میں بھی ایک پہلو جمال کا ہے۔ دوسرا پہلو جلال کا۔ قہاری، جباری، اور جبروت جلال کے مظاہر ہیں اور مخلوق سے محبت اور اس پر رحمت بجوازِ روئے قرآن تمام موجودات پر محیط ہے، جمالِ ایزدی کا اظہار ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات میں جلال و جمال کی صفات میں کوئی تضاد نہیں۔ اسی طرح فن کا کمال یہ ہے کہ اس میں بھی یہ دونوں پہلو اس طرح ایک دوسرے میں سموئے ہوں کہ ان کا ظاہری تضاد ایک وحدت میں رفع ہو جائے۔ اور اقبال کو یہی اعجازِ فن مسجدِ قرطبہ میں نظر آیا۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل